علامہ اقبال کی نظم ''نالۂ فراق'' کی تفہیم وتشریح

ڈاکٹر محمد محسن

کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ملخص:۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی نظم 'نالۂ فراق' ان کی مشہور ترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ جو ان کے اردو کلام کے پہلے شعری مجموعہ 'بانگِ درا' (۱۹۲۴ء) میں شامل ہے۔ یہ نظم انہوں نے اپنے آخوند سے ہجر وفراق کے سبب بے قرار ہو کر تحریر فرمائی تھی جس میں انہوں نے استادِ محترم کی یاد میں خراجِ عقیدت پیش کی ہے۔ علامہ اقبال نے ہمہ وقت کی غمِ جدائی اور استاد سے بے پناہ محبت کی کیفیت کو نہایت ہی درد انگیز انداز میں بیان کیا ہے۔ پروفیسر آرنلڈ کے متحدہ ہندوستان سے یورپ کے ملک انگلستان تشریف لے جانے کے بعد ان کی فراق وفرقت نے علامہ اقبال کے دل ودماغ پر اس طرح اثر انداز ہوا کہ کسی شے کا دیدار گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس نظم میں انہوں نے اپنے دل کی تمناؤں کو اس طور سے بیان کیا ہے کہ جب اپنے استاد سے علم وہنر کے میدان میں مالامال ہونے والے ہی تھے کہ میری بد نصیبی کے عالم سے ایسے حالات رونما ہوئے کہ استاذ اتنے دور چلے گئے کہ جس کی رسائی ممکن نہ ہو سکی۔ نیز یہ کہ نظم کے آخری بند سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اپنے مشفق استاد سے وصل کے واسطے اور اعلیٰ تعلیم کی حصول کی خاطر سرزمینِ ہند سے یوروپ کے ایک ملک برطانیہ تشریف لے جانا چاہتے ہیں۔

~~~~~~~~~~~

کلیدی الفاظ: علامہ اقبال۔ نظم۔ نالۂ فراق۔ ڈاکٹر آرنلڈ۔ مشرق۔ ظلمت وسیاہ۔ تصویر۔ علم فرقت۔ آخوند

شاعرِ مشرق، حکیم الامت علامہ اقبال اسلامی فلسفہ وتعلیمات اور انسان دوست کے ایک عظیم شاعر پوری دنیا کے خاص وعام کے مابین تسلیم کیے جاتے ہیں۔ وہ یکساں طور پر شاعر، فلسفی، مصنف، قانون داں اور سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اردو اور فارسی شعر وشاعری میں ان کو کمال کا مقام حاصل تھا۔ شعر وشاعری کی کائنات میں فلسفیانہ شاعری کا ایسا رود رواں دواں کیے کہ جس کی مثال اردو اور
~~~~~~~~~~~

فارسی شعر وادب میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے کسی ادبیات میں دور دور تک بھی دکھائی نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ شعر وسخن کی دنیا میں جو شہرت ومقبولیت ان کے حصے میں آئی وہ کسی اور شعرائے کرام کو نصیب نہیں ہوئی۔

علامہ اقبال نے 'نالۂ فراق' کے عنوان سے ایک نظم اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ سے جدا ہونے کے سبب ان کی یاد میں تحریر فرمائی تھی یہ نظم ۱۹۰۴ء میں شیخ عبد القادر کا رسالہ 'مخزن' میں پہلی مرتبہ چھپی تھی۔ اس جریدہ کے بانی اور ابتدائی مدیر سر شیخ عبد القادر تھے۔ اس رسالے کا اجرا لاہور میں اپریل ۱۹۰۱ء میں عمل میں آیا تھا جس جاں فشانی کے ساتھ مولوی میر حسن نے علامہ اقبال میں فارسی شعر وادب سے شغف پیدا کیے ٹھیک اسی نہج پر ڈاکٹر آرنلڈ نے اپنی محبت وکاوش سے فلسفہ اور حکمت کا ایک لافانی اور روشن اقبال نامی ایک مینار بنایا۔ جس مینار کی روشنی سے شعر وسخن کے شیدائی استفادہ کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنے شفیق استاد ڈاکٹر آرنلڈ کو 'کلیم ذروۂ سینائے علم' کے لقب سے مخاطب کیا ہے۔ ڈاکٹر آرنلڈ کو یہ فخر حاصل تھا کہ علامہ اقبال کے استاد رہے اور ساتھ ہی علامہ اقبال کو بھی ان کا شاگرد ہونے پر تاحیات شادمانی رہی ہے اور لحد تک یہ اعتراف کرتے رہے کہ میں انہیں کا ثمرہ ہوں۔ اس زمانے کے جید عالم مولانا سید سلیمان ندوی بھی ڈاکٹر آرنلڈ کے عظیم شاگردوں میں شامل رہے ہیں۔

سر تھامس واکر ڈاکٹر آرنلڈ کا جنم انگلستان میں ۱۹، اپریل ۱۸۶۴ء کو ہوا تھا۔ ابتدائی تعلیم لندن سے حاصل کرنے کے بعد انہوں نے یونانی اور لاطینی ادبِ عالیہ میں آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے علاوہ وہ جرمن، اطالوی، فرانسیسی، روسی، ولندیزی (ڈچ)، پرتگالی اور ہسپانوی میں مکمل طور پر عبور حاصل کرنے کے بعد عربی، فارسی اور سنسکرت میں بھی کمال کی صلاحیت پیدا کر لی تھی۔ وہ فلسفے کے تو ایک اچھے استاد تو تھے ہی ساتھ ہی ماہرِ مورخ بھی تھے لیکن ان تمام علم وفن کے علاوہ وہ ایسے برطانوی مستشرق تھے جن پر پروردگارِ عالم کا خاص لطف وکرم تھا حیرانی کی بات ہے کہ ایک مستشرق ہونے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلامی فلسفہ وشعریت، قرآنی تعلیمات وحدیث، تہذیب وتمدن اور ثقافت ومعاشرت کا مطالعہ بڑے ہی عشق وجنون کے ساتھ مکمل کر لیا تھا۔ ان تمام علوم پر بلا کی مہارت رکھتے تھے۔ اس علوم کی روشنی میں انہوں نے علم وفضل کے ایسے دریا بہائے جس سے بنی آدم فیض یاب ہو رہے ہیں۔ ان کا یہ کارنامہ دوام ہے۔ یہ کہنا کوئی حرج کی بات نہیں کہ جب تک اس فانی دنیا کا وجود رہے گا تب تک آرنلڈ تیرا نام روشن ومنور رہے گا۔

برطانوی حکومت کی جانب سے ڈاکٹر آرنلڈ لگ بھگ ۱۸۸۷ء میں علی گڑھ کے ایک کالج محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے تھے۔ یہاں ان کی ملاقات عربی وفارسی کے استاد مولانا شبلی نعمانی سے ہوئی تھی۔ علم کا نعم البدل یہ رہا کہ عربی زبان وادب سے عشق کے سبب پر انہوں نے مولانا شبلی نعمانی کے زیرِ سایہ عربی کی کئی مشہور کتابوں کا مطالعہ کیا۔ مولانا شبلی اسی درمیان ان سے فرینچ زبان کا درس لیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر آرنلڈ کی ایک کتاب ۱۸۹۵ء میں منظرِ عام پر آئی تھی جس کا نام 'پرچنگ آف اسلام' تھا جو مدتوں جانفشانی کے بعد وجود میں آئی تھی۔ جس میں انہوں نے یہ تحریر فرمایا تھا کہ مذہبِ اسلام تلوار کی طاقت سے نہیں بلکہ اپنے اخلاقی ومساواتی پیغام کی وجہ سے پھیلا ہے۔ دورانِ قیام علی گڑھ میں سر سید احمد خان سے انہیں اچھا خاصا والہانہ لگاؤ ہو گیا تھا انہیں کے ایما واشارے پر ڈاکٹر آرنلڈ نے اپنی ایک مشہور ومعروف کتاب 'اسلام کی تبلیغ' تصنیف فرمائی۔ یہ کتاب بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی اور انہیں خراجِ تحسین بھی پیش کیا گیا۔

مندرجہ بالا خدمات انجام دینے کے بعد یہ علم وفلسفہ کا گہوارہ ۱۹۰۴ء میں اپنے آبائی سوئے درودیار چلا گیا اور وہاں (ولایت) انڈیا آفس میں لائبریرین کے عہدے پر فائز ہوا۔ بعدہٗ عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے ۱۹۲۰ء کو لندن یونیورسٹی آف اورینٹل اسٹڈیز میں گراں بہا خدمات انجام دینے لگے۔ قدرت کے زیرِ نظام کائنات کی ہر شے ہے اس لیے اس نظام سے کائنات کی کوئی شے نافرمانی کر ہی نہیں سکتی تو پھر ڈاکٹر آرنلڈ کیونکر انحراف کرتے۔ آخر کار ۹؍جون ۱۹۳۰ء کو دارِ فانی سے دارِ بقا کی جانب منتقل کر گئے۔

ڈاکٹر آرنلڈ ۱۸۹۷ء میں علی گڑھ سے لاہور تشریف لے آئے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے استاد مقرر ہوئے۔ علامہ اقبال بھی اُس کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔ اسی کالج سے استادی اور شاگردی کا سلسلہ پروان چڑھا۔ علامہ اقبال نے فلسفہ کی تعلیم ڈاکٹر آرنلڈ سے دورانِ قیام لاہور ہی میں حاصل کر لی تھی اپنے عظیم شاگرد میں علم کا ذوق وشوق دیکھ کر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان جانے کا بیش بہا مشوروں سے نوازا۔ اس مشورے پر دل وجان سے عمل کرتے ہوئے ۱۹۰۵ء میں علم کے حصول کی غرض سے ولایت تشریف لے گئے تھے۔ جہاں ان کی ملاقات پروفیسر آرنلڈ سے تو ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ فلسفے کے کئی ماہر اساتید سے مستفیض ہونے کا موقع میسر آیا جس سے علامہ اقبال کو اپنی شاعری میں فلسفیانہ مضامین کا اظہار کرنا خاصا آسان ہو گیا۔ بجز یہ کہ علامہ اقبال نے میونخ یونیورسٹی سے اپنے تحقیقی مقالہ 'فلسفۂ عجم' پر پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

علامہ اقبال شاعر کہلوانا پسند نہیں کرتے تھے۔ شاعری کا میدان اس لیے انتخاب کیا تھا کہ قوم تک اپنے افکار و نظریات کا پیغام پہنچا سکیں۔ لیکن قوم انہیں صرف ایک شاعر سمجھتی تھی۔ اس لیے قیام یوروپ کے دوران شاعری ترک کرنے کا ارادہ کیا جس کی وجہ سے جریدہ 'مخزن' کے مدیر شیخ عبدالقادر سے بحث و تکرار ہو گئی۔ دونوں اس امور پر تیار ہوئے کہ اپنے استاد ڈاکٹر آرنلڈ کے ہاں چلتے ہیں جو مشورہ دیں گے عمل کیا جائے گا۔ ڈاکٹر آرنلڈ نے کہا کہ آپ کی شاعری عام شعراء کی طرح نہیں ہے بلکہ آپ کی شاعری بنی آدم کی فلاح و بہبود کے لیے ہے۔ یہیں سے علامہ اقبال کی شاعری میں ایک بڑی تبدیلی آئی کہ اردو کے بجائے فارسی میں شاعری کرنے لگے تا کہ ان کے خیالات و تصورات سے زیادہ سے زیادہ نوعِ انسان استفادہ کر سکیں۔

اس نظم میں علامہ اقبال نے مرزا عبدالقادر بیدلؔ کے دو اشعار اور امیر مینائی کا ایک شعر شامل کیے ہیں۔ اس لیے یہ درست ہو گا کہ ان شعراء کا مختصر تعارف تحریر کر دیا جائے۔

مرزا عبدالقادر بیدلؔ کا جنم ۱۶۴۴ء میں بہار کے دارالحکومت عظیم آباد (پٹنہ) میں ہوا تھا۔ فارسی زبان کے ایک بہت بڑے مصنف اور جید عالم تھے۔ فارسی شاعری میں مہارت رکھتے تھے۔ شاعری کے ذریعے روحانیت و معرفت کا پیغام کثرت سے ملتا ہے۔ بیدلؔ کے خاندان ترک قوم کے قبلیہ برلاس سے ہے۔ ان کے آبا واجداد وسط ایشیا سے ہجرت کر کے ملکِ ہندوستان آکر عظیم آباد میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کی بدقسمتی یہ رہی کہ بچپن میں ہی یتیم ہو گئے اور پرورش و پرداخت کی ذمہ داری چچا مرزا قلندر کے سر آئی۔ جنہوں نے زمانے کے مشہور و معروف علماء و فضلا سے اعلیٰ تعلیم دلوائی اور وہ قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد عربی و فارسی نظم و نثر کا مطالعہ بھی نہایت ہی لگن کے ساتھ کر لیے تھے۔ اس دوران انہوں نے رود کی، امیر خسرو اور ملا جامی جیسے بڑی شخصیت کو بھی بغور مطالعہ کیا تھا۔ بیدلؔ اس قدر ذہین و فہیم تھے کہ جو سنتے یا پڑھتے ان کے دل و دماغ پر رچ بس جاتا تھا جس سے جلد ہی شعر گوئی کے اسرار و رموز پر بھی مہارت حاصل کر لی۔ ان کی شاعری ہم عصر شعراء سے زیادہ ممتاز ہے۔ فارسی شاعری کے ایک اہم طرز جسے 'سبکِ ہندی' کہا جاتا تھا۔ اسے انہوں نے اپنی شعری صلاحیت کی بنا پر اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔ اپنی شاعری کے آغاز میں 'رمزی' تخلص رکھتے تھے لیکن گلستان شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا مطالعہ کرنے کے بعد خیال میں تبدیلی آئی اور تخلص 'بیدل' اختیار کیا جو ایامِ آخر تک لکھتے رہے۔ بیدلؔ کی وفات دہلی میں ۲۳، نومبر ۱۷۲۰ء کو ۷۶ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔

امیر مینائی کا نام امیر احمد تھا ۱۸۲۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر مکمل کرنے کے بعد مفتی سعد اللہ مر آبادی سے فارسی وعربی زبان کا درس لیا۔ اپنی ابتدائی شاعری کی اصلاح انہوں نے منشی مظفر علی اسیرؔ سے لی۔ اور اردو شاعری کی دنیا میں بہت جلد مشہور ہو گئے تھے ۔ ان کی شاعری میں دبستانِ لکھنؤ کی خارجیت اور دبستانِ دہلی کی داخلیت دونوں کا حسین امتزاج ہے جو انہیں اپنے ہم عصر کے تمام شعراء میں بلند مقام عطا کرتا ہے۔ تلاشِ معاش کی خاطر ہندوستان کے مختلف شہروں میں جانا پڑا لیکن ان شہروں میں سے کہیں بھی مکمل طور پر سکونت اختیار نہیں کر سکے۔ اپنے خاص دوست داغ دہلوی کے مشورے سے حیدر آباد (دکن) تشریف لے گئے لیکن وہاں کی آب وہوا انہیں راس نہیں آئی وہ شدید بیماری سے صحت یاب نہیں ہو سکے۔ ۱۳؍ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو اپنے محبوبِ حقیقی سے جا ملے اور وہیں حیدر آباد (دکن) میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

زیرِ مطالعہ نظم 'نالہ ٔ فراق' ہے جو مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ جس کا مرکزی موضوع استاد اور شاگرد کی فرقت ہے۔ شاعر نے اس نظم کو اپنے استاد کی جدائی کی لازوال یاد میں تحریر کی ہے۔ اس کے ہر بند میں استاد کی علمی لیاقت کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ ساتھ استاد کے فراق میں بھی اپنے درد و غم کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ بہر حال ہر بند کی تشریحات مندرجہ ذیل ہیں:

شاعر فرمارہے ہیں کہ: اے کشورِ ہندوستان تیری سر زمین میں وہ حسن یا کشش و دلکشی باقی نہ رہی جو پروفیسر آرنلڈ کو تیری لحد راس نہیں آئی۔ وہ کیونکر مغرب کو واپس لوٹ گئے۔ جب کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ملکِ ہندوستان کی بو باس میں ہی گزارا۔ ہمارا ملک ایسا رہا ہے جہاں صدیوں سے ہر تہذیب وثقافت کے ماننے والے پر امن طریقے سے آباد رہے ہیں اور یہاں ہر مذاہب اور ادیان کی قوم کو مساوات کا حق حاصل ہے۔ یہاں رنگ و نسل کے لحاظ سے کسی طرح کا کوئی تعصب پرستی نہیں ہے۔ بلکہ باشندگانِ ہندوستان کا دستور ہے کہ مہماں ہمارا جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ یہی وجہ رہی ہے کہ دنیا کی ہر قوم ہندوستان آکر آباد ہوتے رہے ہیں۔ اسی لیے تو شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے کہا تھا 'کہ جنت سے بھی زیادہ حسین و جمیل ہمارا ملکِ ہندوستان ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ پروفیسر آرنلڈ کو اپنے شاگرد علامہ اقبال سے بے پناہ شفقت و ہمدردی رہی ہے اور علامہ اقبال کو بھی اپنے استاد محترم سے بھی بے پناہ الفت تھی۔ باوجود اس کے انہیں ہندوستان کی مٹی کیوں پسند نہیں آئی اور زندگی کے آخری ایام میں انگلستان واپس جانے پر آمادہ ہو گئے۔ اس کے بعد شاعر فرماتے ہیں کہ ہمیں اس سچائی سے اعتراف ہے کہ فراق کے لمحات بہت درد انگیز ہوتے ہیں۔ کسی بھی جاندار شے کے لیے روزِ فرقت کی تابانی ظلمت و سیاہ سے کیا کم ہے، قطعاً نہیں۔ البتہ ہر انسان کے لیے فراق کا دن بہت ہی غم والم کا دن ہوتا ہے۔ اور اس کا تاب برداشت کرنا بہت ہی دشوار کن ہے۔ آیاتِ قرآنی کی روشنی میں یہ بیان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے وطن کنعاں سے جب اپنے بھائیوں کی

نادانی کی وجہ سے جدا ہو گئے تھے تو انہیں بھی جدائی کا غم تھا۔ یہاں بھی علامہ اقبال کو اپنے استادِ محترم آرنلڈ کو ہندوستان سے برطانیہ چلے جانے پر شدید رنج و غم تھا اور جن کی فراق میں ہمیشہ وہ غمزدہ رہتے تھے۔ اس بند کے آخری شعر میں شاعر کہہ رہے کہ فرقت کی تاب کو برداشت کرنا نہایت ہی ثقیل تھا، بہت تأسف کے ساتھ استاد کو الوداع کہا اور اس وقت کا عالم یہ تھا کہ میری چشم کی ضیاء پھیکی اور ماند پڑ گئی تھی گویا میری آنکھیں بجھی ہوئی ایک فانوس کی مانند تھی۔ میرا دل اب اس در و دیار میں لگتا نہیں۔ غرض کہ کسی کی دید من بھاتی نہیں۔ پہلے بند کا آخری شعر مرزا عبدالقادر بیدل کا ہے جو اس نظم میں شامل ہے۔

نظم کے دوسرے بند میں شاعر اپنے دل کی اضطراب اس طور سے بیان کرتے ہیں کہ احساسِ خلوت کے سبب میں شکستِ پا ہو گیا ہوں اور ساتھ ہی فرقت کی چوٹ کھایا ہوا ایک انساں ہر وقت محسوس کرتا رہتا ہوں جس کے سبب مجھ میں یہ کیفیت طاری ہو گئی ہے کہ آبادی سے دل گھبرانے لگا ہے۔ اور میں دیارِ حرماں سے کوسوں دور چلا جاتا ہوں۔ یہاں شاعر اپنی تنہائی کو شعر کے قالب میں اس طرح ڈھال دیا کہ جو جگ کی تنہائی بن گئی ہے۔ اس بند میں آگے اس انداز سے اپنے دل کے غبار کو تحریر کرتے ہیں کہ استاد کی سرپرستی میں گذرے ہوئے پل جب مجھ کو یاد آتے ہیں تو میں اپنے آپ کو مضطرب پاتا ہوں اور تسکینِ دل کی خاطر تجھ جانب دوڑ جاتا ہوں۔ یہاں علامہ اقبال استاد کے ساتھ گزرے ہوئے ایام کو یاد کرتے ہوئے یادوں کے بھنور میں کھو جاتے ہیں۔ جس کے سبب ان کا قدم خود بخود استاد کی سمت گامزن ہو جاتا ہے۔ بند کے آخر میں شاعر اپنی کیفیت اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ اے میرے استاد میں پوری طرح آپ کے وطن سے واقفیت رکھتا ہوں لیکن میرے طرزِ عمل یعنی زندگی بسر کرنے کے جو طریقے ہیں اس وجہ سے ایک ناآشنائی کا رنگ نمایاں ہو گیا ہے۔ مزید یہ کہ شاعر ان سے اپنی واقفیت اور ان کے زیرِ نگراں زندگی کی پرورش کا بھی اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ آرنلڈ کے ملک سے بھی اپنی آگاہی کا اظہار کرتے ہوئے یہ اعتراف کرتے ہیں کہ جو اجنبیت ہے وہ ہماری کج روی کی بنا پر ہے۔ مثال کے لیے شعر پیشِ خدمت ہے:

کشتۂ عزلت ہوں آبادی میں گھبراتا ہوں میں

شہر سے سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں

بادِ ایام سلف دل کو ٹرپاتا ہوں
بہر تسکیں تیری جانب دوڑ تا آتا ہوں
آنکھ گو مانوس ہے تیرے درودیوار سے
اجنبیت ہے مگر پیدا میری رفتار سے

تیسرے بند کے پہلے شعر میں شاعر فرماتے ہیں کہ میں اپنے استاد کے ذریعے علم کی دولت سے مالا مال ہونے والا تھا ساتھ ہی میرا قلب و جگر بھی علم کی تجلیات سے ہمکنار ہو رہا تھا۔ گویا علم وادب کی دنیا سے ہم بہرہ مند ہونے ہی جارہے تھے کہ اسی دوران ہمارے معلم اپنی نوکری سے سبک دوش ہو کر انگلستان کو اپنی جائے پناہ بنالی۔ شاعر یہ اظہار کرتے ہیں کہ میں تشنۂ علم رہا غرض کہ اعلیٰ تعلیم کے حصول سے محروم رہا۔ البتہ قدرت کے نظام سے کیا شکوہ کہ کلکِ ازل نے اپنی تقدیر کچھ ایسی ہی بنائی ہے۔ جب یہ مٹی کا پتلا اپنے رنگ پر آنے والا ہی تھا کہ اپنے رہنما سے کوسوں دور ہو گیا ۔ جس کی دوری کا فاصلہ طے کرنا نہایت ہی مشکل ہو گیا۔ اس بند کے دوسرے شعر میں بھی پہلے شعر کی ہی صدا سنائی دیتی ہے اپنے رنج والم کو ظاہر کرتے ہوئے شاعر یوں کلام کرتے ہیں کہ میرے ارمانوں کے شجر میں پھول و پھل لگنے کو تھا اور کسی کو غیب کی کیا خبر کہ ہم علم کی دنیا میں کیا سے کیا ہونے جارہے تھے ساتھ ہی علم کے کمالات سے مجھ میں ایک بڑا تبدل و تغیر ہونے جارہا تھا۔ غرض میں بلند پرواز کی طرف مکمل طور پر گامزن ہی تھا کہ ہمارے استاذ اپنے ملک کو ہجرت کر گئے اور شاعر حصولِ علم کی لگن میں تڑپتے رہے۔ اس بند کے آخر میں شاعر اپنے استاد کے سلسلے سے مزید یہ فرماتے ہیں کہ رحمت کے ابر میرے علم کے گلستاں پر زیادہ مدت تک لطف و کرم نہ کر سکے۔ وہ رحمت کا پیکر میرے خوابوں کی کلیوں پر بہت ہی کم وقت کے لیے رحمت کی بارش بن کر برسے اور وہ پھر اپنی منزل کی طرف لوٹ گئے۔ یہاں یہ مراد ہے کہ علامہ اقبال اپنے استاد سے زیادہ مدتوں تک فائدہ نہ اٹھا سکے کیونکہ پروفیسر آرنلڈ اپنی نوکری سے آزاد ہو کر ولادیت چلے گئے۔

چوتھے بند میں یہ بیان ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے استاذ پروفیسر آرنلڈ کو 'کلیم زروۂ سینۂ علم' کے لقب سے مخاطب کیا ہے۔ شعر میں یوں فرماتے ہیں کہ اے علم و حکمت کے گہوارے، اے کوہِ طور کی بلند ترین چوٹی پر موسیٰ علیہ السلام کی مانند عظمت رکھنے والے ہمیں نہیں معلوم کہ آپ کہاں اور کس دیس میں گوشہ نشیں ہو گئے ہیں۔ وہ علم کی دنیا کی ایسی عظیم شخصیت تھی کہ جس کی صحبت میں گزرا ہوا ایک پل بھی زندگی کے ہزار سال سے افضل ہے۔ اس لیے کہ آرنلڈ کی شخصیت ایک ایسی جامعات کی مانند تھی جس کی صحبت میں رہ کر علم حاصل کرنے کے ذوق وشوق میں مزید توسیع

ہوتی تھی۔ آگے شاعر فرماتے ہیں کہ تیرے چلے جانے کے بعد مجھ میں علم حاصل کرنے کا جو عشق وجنون اور چاہت ولگن تھی اب وہ باقی نہیں رہی۔ چونکہ اس خاک کے پیکر کو جو علم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا تھا اس میں آپ ہی کا کار فرماں تھا۔ بہر کیف آرنلڈ کے پڑھانے کا ایسا انوکھا انداز تھا کہ جو پڑھاتے تھے وہ ہو بہو دل و دماغ میں اتر جاتا تھا۔ اس لیے ان کے لیے درس و تدریس میں روز بروز طلبا کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جس وجہ سے پروفیسر آرنلڈ کا نام علی گڑھ اور لاہور میں ہی نہیں بلکہ اس وقت کے پورے متحدہ ہندوستان میں مشہور و معروف ہو گیا۔ اس لیے دور دراز کے طلبا حصولِ علم کی جستجو میں مستفید ہونے کے لیے بھاگے اور دوڑے چلے آتے تھے۔ اس بند کا آخری شعر بھی مرزا عبد القادر بیدلؔ کا ہے جس کی تفہیم اس طرح ہے کہ اب طلبہ وطالبات میں علم حاصل کرنے کے واسطے اضطرابی کہاں کہ استاد کی جستجو میں وہ عشق وجنوں پیدا کرے۔ ساتھ اس شعر کے ذریعے علامہ اقبال نے اپنے استاذِ سے بے پناہ محبت کا اظہار بھی کیا ہے۔ مزید یہ کہ اس شعر میں لیلا مجنوں کی لازوال محبت کے استعارے میں اپنے استاذ سے بے پناہ محبت کی تصویر کشی کی ہے۔

اس نظم کے آخری بند میں شاعر موضوع کو تسلسل کے ساتھ اختتام کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنے خیالات وجذبات اور احساسات و نظریات کا اظہار کر رہے ہیں کہ وہ لمحہ اب زیادہ دور نہیں کیونکہ اب استاذ سے ملاقات ہونے والی ہے۔ یہ بندۂ ناچیز ایک دن تمام بندشوں کو توڑ کر استاد سے ملنے کی خاطر پنجاب سے ولایت ضرور حاضر ہو گا۔ اب یہاں شاعر نظم کے اختتام میں یہ فرماتے ہیں کہ میری دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ میری یہ تشنۂ چشم تیری تصویر کو رغبت سے نظارہ کرتی رہتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو صدیوں سے تکلم کے لیے آرزومند ہو وہ بشر تیری تصویر دیکھ کر کیسے سکونِ قلب حاصل کر سکتا ہے۔ تصویر تو بے جان اور خشک اشیا ہے۔ قدرت نے اسے قوتِ گویائی نہیں بخشی ہے۔ اس لیے تصویر کی کوئی زبان نہیں ہوتی بلکہ خاموشی ہی اس کی زبان ہے۔ بہر حال اس بند کا آخری شعر امیر مینائی کا ہے۔ مثال کے لیے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کھول دے گا دشت وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو
دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تیری تصویر کو
کیا تسلی ہو مگر گرویدۂ تقدیر کو
تاب گویائی نہیں رکھتا ہے دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا

مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں خواجہ حمید یزدانی لکھتے ہیں کہ:

”وہ دن آئے گا یا قریب ہے۔ جب محبت و دیوانگی کا ہاتھ تقدیر کی گتھی سلجھا دے گا، اور وہ یوں کہ میں پنجاب کی زنجیر توڑ کر آپ کے پاس دوڑ کر پہنچوں گا۔ چونکہ علامہ لاہور میں تھے جو صوبۂ پنجاب کا دارالخلافہ رہا ہے اور آج بھی اس لیے یہ کہا ہے کہ اس کی زنجیر توڑ کر پہنچوں گا۔

اگرچہ میری حیرت زدہ آنکھیں آپ کی تصویر کو دیکھتی رہتی ہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ جو گفتگو کا مشتاق و شیفتہ ہو وہ بھلا تصویر دیکھ کر کیوں کر تسلی پائے گا۔ اس لیے کہ تصویر کے منہ زبان میں بولنے کی طاقت نہیں ہے۔ تصویر کی گفتگو کو تو خاموشی کہا جاتا ہے۔ یا خاموشی ہی تصویر کی گفتگو ہے۔“

(صفحہ نمبر ۱۲۳۔ ۱۲۲، شرح بانگِ درا......ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی)

الغرض نظم ”نالۂ فراق“ علامہ اقبال کی ایک شاہکار نظم ہے جو پروفیسر آرنلڈ کی یاد میں لکھی گئی ہے۔ آرنلڈ اپنی ملازمت سے فارغ ہو کر ہندوستان سے انگلستان چلے گئے تھے جس بنا پر علامہ اقبال غم زدہ رہنے لگے تھے استاذ کی یاد میں لمحہ بہ لمحہ اضطراب کے عالم میں رہتے تھے۔ نظم کے ہر بند میں استاذ سے جدائی کی کیفیت کی تصویر کشی بڑے فنکارانہ انداز سے کار فرما ہے۔ نظم کے آخر میں علامہ اقبال اپنے دل کا غبار بیان کرتے ہیں اور استاد کے دیدارِ شوق میں انگلستان جانے کا مستحکم ارادہ کر لیتے ہیں۔

Tareekh- e- Adab- e Urdu
Quarterly Bilingual Interdisciplinary Research Peer-Reviewed Journal
تاریخ ادب اردو